(سیرتُ الصُّوفی)

(معمولاتِ سالکین)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	خطبۂ ماثورہ	۹
۲	وجہ بیان	۱۰
۳	دین میں دشواری نہیں	۱۱
۴	احکام دین میں سختی کی مثال	۱۲
۵	احکام دین پر عمل نہ کرنے کے عذر	۱۳
۶	دنیاداری کی حقیقت	۱۴
۷	ولایت عامہ	۱۵
۸	ناپسندیدہ القاب	۱۶
۸	تواضع میں غلو	۱۷
۹	اپنے نفس کی قدر کرنے کی وجہ	۱۷
۱۰	تسبیح کا فائدہ	۱۹
۱۱	درود شریف کی برکت	۱۹

۱۲	جماعت سے نماز پڑھنے کا فائدہ	۲۰
۱۳	اچھی نیت کا فائدہ	۲۱
۱۴	شبہ کا جواب	۲۲
۱۵	تسلی آمیز خطاب	۲۲
۱۶	صبر کی تلقین	۲۳
۱۷	حضور ﷺ کے غم وافسوس کی وجہ	۲۴
۱۸	طبعی غم کا فائدہ	۲۵
۱۹	انسانوں کی اقسام اوراس کی مثال	۲۶
۲۰	کیفیات وجدانیہ میں غلطی لگنا	۲۷
۲۱	ثمرات کے طالب نہ بنو	۲۸
۲۲	عارف کا حال	۲۹
۲۳	مقصود رضاء الٰہی ہو	۲۹
۲۴	طبعی میلان کا حکم	۳۰
۲۵	حضور ﷺ کے زمانہ کے قرب کی برکت	۳۱
۲۶	ارشاد نبوی ﷺ پر عمل کرنے کا فائدہ	۳۲
۲۷	ارتکاب گناہ سے بچنے کا طریقہ	۳۳

۲۸	وسوسہ کا علاج	۳۴
۲۹	تعلقات کی اقسام و احکام	۳۵
۳۰	تعلق مع اللہ	۳۵
۳۱	نماز تہجد کے احکام	۳۶
۳۲	نفس کی دلداری	۳۷
۳۳	اسراف سے احتراز	۳۷
۳۴	وسوسہ کے آنے سے پریشان نہ ہو	۳۸
۳۵	توبہ کرنے کا طریقہ	۳۹
۳۶	حق تعالیٰ کا قرب مقصود ہے جیسے بھی ہو	۳۹
۳۷	تلاوت قرآن کا فائدہ	۴۰
۳۸	ذکر میں جہر وضرب کی قید کی وجہ	۴۱
۳۹	وحی النبی کا وزنی ہونا	۴۲
۴۰	سالکین کی مختلف کیفیات کی وجہ سے اور فائدہ	۴۳
۴۱	قیام اللیل کا فائدہ	۴۴
۴۲	نماز میں حضور قلب حاصل ہونے کا طریقہ	۴۵
۴۳	مخلوق کی طرف توجہ کمال کے منافی نہیں	۴۵

۴۴	تغیر احوال کا فائدہ	۴۶
۴۵	منتہی کو خلوت میں عبادت کا فائدہ	۴۷
۴۶	کامل کے متوجہ الی الخلوق ہونے پر شبہ اور اسکا جواب	۴۸
۴۷	تفسیری نکتہ	۴۹
۴۸	قطع تعلق کے معنی	۵۰
۴۹	سالکین کو توکل کی ضرورت	۵۱
۵۰	معمولات	۵۲
۵۱	صبر کی تعلیم اور تسلی کا مضمون	۵۳
۵۲	وعظ کی وجہ تسمیہ	۵۴
۵۳	صوفیاء کے چادر اوڑھنے کی وجہ	۵۴
۵۴	لفظ صوفی کے معنی	۵۵

وعظ

(سیرتُ الصُّوفی)

(معمولاتِ سالکین)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے وعظ ''سیرت الصوفی'' ۲۳/صفر ۱۳۲۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر تقریبا ساڑھے تین گھنٹے تک ارشاد فرمایا مولانا نور حسین صاحب پنجابی نے قلم بند فرمایا۔ بعض سالکین کی درخواست پر یہ وعظ ہوا تھا جس میں سالکین کے طرز زندگی اور تصوف کی حقیقت اور معنی کو خوب وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ باطنی اصلاح کے خواہش مند افراد کے لئے یہ وعظ انتہائی مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۳/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۴ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِیۡلًا ۙ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ○ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیۡلِ هِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِیۡلًا ؕ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ؕ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡهِ تَبۡتِیۡلًا ؕ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِیۡلًا ○ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ○ وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُكَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَةِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا ○ اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡكَالًا وَّجَحِیۡمًا ۙ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا ○ یَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ وَكَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِیۡبًا مَّهِیۡلًا ○

(۱) سورۂ مزمل: ۱۔۱۴۔

''اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات کہ اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب خوب صاف پڑھو ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں بے شک رات کا اٹھنا خوب مؤثر ہے کچلنے میں اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے اور بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کرکے اس کی طرف متوجہ ہو وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اُسی کو اپنے کام سپرد کرنے کے لئے قرار دیئے رہو اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہوجاؤ اور مجھکو اوران جھٹلانے والوں کو نازونعمت میں رہنے والوں کو چھوڑ دو اور تھوڑے دنوں اور مہلت دے دو ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے جس دن پہاڑ اور زمین ہلنے لگیں گے اور پہاڑ ریگ رواں ہوجائیں گے''۔

وجہ بیان

بعض احباب ارباب سلوک نے مجھ سے استدعا کی کہ اگر ہمارے لئے کچھ دستورالعمل کے طور پر بیان ہوجائے تو بہتر ہے۔ اُس وقت بوجہ کسی مضمون کے حاضر نہ ہونے کے اور نیز ایسے مضامین کے لئے خلوت مناسب ہونے کے میں نے حتمی وعدہ نہیں کیا مگر آج صبح کو سورۂ مزمل کی یہ ابتدائی آیات قلب میں وارد(۱) ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اُن میں تمام تر طریق سلوک ہی مذکور ہے۔

(۱) دل میں آئیں۔

اس لئے آج انہیں آیات کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے اور بیان سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا کیا نفع ہوگا۔ یہ طریقہ تو خواص کے لئے ہے ہم دنیا داروں کے لئے نہیں۔ سو بات یہ ہے کہ سرے سے یہ تقسیم ہی صحیح نہیں کہ دنیاداروں کے لئے اور احکام اور دینداروں کے لئے اور احکام۔ کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اور احکام شرعی سب کے ساتھ یکساں متعلق ہیں۔ بلکہ حقیقت میں مسلمان دنیادار ہوتا ہی نہیں کیونکہ دنیاداری حقیقت میں یہ ہے کہ حرام و حلال میں کچھ امتیاز نہ رہے جس طرح سے بنے مال(۱) حاصل کرنے کو مقصود سمجھے۔

دین میں دشواری نہیں

اگر کہیں دونوں غرضیں دین و دنیا کی جمع ہو جائیں تو دنیوی غرض کو مقدم رکھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ دین سے ہم کو کوئی غرض نہیں کیونکہ شریعت کے احکام اس قدر دشوار ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کریں تو دنیا کی زندگی مشکل ہے سو ظاہر ہے کہ اسلام کے ساتھ ان خیالات کی گنجائش کہاں ہے۔ کیونکہ اس سے تو باری تعالیٰ کی تکذیب(۲) کی نوبت پہنچتی ہے۔ ﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ ”اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ احکام میں دشواری منظور نہیں“ ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے“

اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ ہم تکذیب نہیں کرتے مگر جب واقعات ہی

---

(۱) ممکن ہو سکے (۲) اللہ کو جھٹلانے کی نوبت آتی ہے۔

روز مرہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ احکام شرعیہ پر چلنا بہت مشکل ہے تو ہمارا کیا قصور ہے۔ اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ ایک مشقت تو ہوتی ہے ذات حکم میں مثلاً وہ حکم فی حد ذاتہ (۱) سخت اور دشوار ہو۔ یہ اصرار اور اغلال کہلاتے ہیں (۲) امم سابقہ میں (۳) بعض ایسے احکام تھے مگر اس امت میں اس قسم کے احکام نہیں رکھے گئے۔

احکام دین میں سختی کی مثال

اور ایک مشقت یہ ہے کہ دراصل ذات حکم میں تو کوئی دشواری نہیں مگر ہم نے اپنے اغراض فاسدہ (۴) کی وجہ سے خود اپنی حالت ایسی بگاڑ لی اور قوم نے متفق ہو کر شریعت کے خلاف عادتیں اختیار کر لیں کہ وہ رسم عام ہو گئی اور ظاہر ہے کہ جب اس رسم عام کے خلاف کوئی حکم شرعی پر چلنا چاہے گا تو ضرور اس کو اس آسان اور بے ضرر حکم میں دشواری پیدا ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو دو پیسہ کا نسخہ لکھ دے مگر مریض چونکہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے جہاں کے لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس قسم کی ضروری اور مفید چیزوں کی رغبت نہیں رکھتے وہ چیزیں وہاں نہیں مل سکتیں۔ اس دو پیسہ کے نسخہ کو وہاں نہیں پی سکتا۔ اب فی نفسہ گراں نہیں کمیاب (۵) نہیں مگر اس گاؤں والوں نے خود اپنا دستور بگاڑ رکھا ہے۔ اس واسطے وہاں نہیں مل سکتا۔ اس صورت میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ علاج بالکل آسان ہے۔ مگر یہ تصور اس جگہ کے رہنے والوں کا ہے کہ ایسی معمولی چیزیں بھی نہیں مل سکتیں۔ ایسا ہی ہمارا حال ہے کہ مجموعۂ قوم نے مل

(۱) اپنی ذات کے اعتبار سے (۲) بیڑیاں ڈالنا یعنی بہت ہی مشکل احکام اپنی ذات کے اعتبار ہی سے سخت مشکل ہے (۳) پہلی امتوں میں ایسے سخت احکام تھے (۴) اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے (۵) اس کے میسر آنے میں کوئی کمی نہیں ہے۔

کر ایسی حالت بگاڑ دی ہے کہ اب احکام شرعیہ کے بجالانے میں دشواری پیدا ہوگئی ہے مثلاً بہانہ کیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے بھلا اگر رشوت نہ لیں تو کام کیسے چلے اگر اپنے اخراجات اندازہ سے رکھے جائیں تو تنخواہ کیوں نہ کفالت کرے۔ یا مثلاً عام طور پر بیر۔ آم کی بیع۔ پھل آنے سے پہلے کی جاتی ہے اور اگر ایک بچنا چاہے تو ضرور کسی قدر دقت پیش آتی ہے لیکن اگر سب اتفاق کرلیں کہ اس طرح سے کوئی خرید وفروخت نہ کرے تو دیکھیں پھر کیا دشواری پیش آتی ہے۔ دشواری حقیقی تو وہ ہے کہ اگر سب مل کر بھی اس کو دور کرنا چاہیں جب بھی دور نہ ہوسکے اور جو سب مل کر اس مذموم رسم (۱) اور طریق کو چھوڑنا چاہیں اور وہ چھوٹ جائے تو یہ دشوار نہیں، آسان ہے۔ یہ عارضی دشواری تو صرف اپنا طرز معاشرت بگاڑ دینے اور طریق تعامل کو خراب کردینے سے پیدا ہوگئی ہے سو یہ تنگی خود اپنے اوپر تنگی ڈال لینے سے ہوئی۔ تعجب ہے کہ خود اپنی تنگی کو نہ دیکھیں۔ شریعت پر تنگی کا الزام دیں۔

احکام دین پر عمل نہ کرنے کے عذر

جیسا کہ اس شیر نے جس کا قصہ مثنوی میں ہے خرگوش کے بھاگنے سے اپنا عکس دیکھا اور اس کو دوسرا شیر سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کو کنویں میں کود پڑا دراصل وہ خود اپنے اوپر حملہ کررہا تھا۔ ایسے ہی ہم اپنے عیب کو آئینہ شریعت میں دیکھ رہے ہیں اور ناسمجھی سے اُس کو شریعت کی تنگی بتلارہے ہیں سو یہ درحقیقت شریعت پر حملہ نہ ہوا بلکہ خود اپنی ذات پر حملہ کررہے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد　　ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

''بیوقوف تو اپنے اوپر ہی حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا''

(۱) بری رسم کو۔

ہماری تنگی کا یہی قصہ ہے۔ بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم ناجائز معاملات رشوت ستانی وغیرہ ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ لوگ جس کو ضرورت کہتے ہیں وہ ضرورت بھی نہیں۔ بلکہ محض حظوظ نفسانیہ ہیں(۱) جن کا نام ضرورت رکھ دیا ہے۔ مثلاً کسی کی نوکری کے پیسے میں اتنی گنجائش ہے کہ معمولی درمیانی قیمت کے کپڑے پہن سکتا ہے۔ مگر بیش قیمت زرق برق کپڑے بنانے کی گنجائش نہیں اس صورت میں عقلمند آدمی کبھی بھی ایسے گراں قدر کپڑوں کی ضرورت تسلیم نہیں کرسکتا کہ جس ضرورت کے واسطے رشوت لینا پڑے اور اگر اس پر بھی کچھ تنگی ہو تو آخر صبر کی تعلیم اسی حالت کے لئے ہے اور جو مرتبہ صبر سے گزر جائے تو ایسے لوگوں کی امداد کے واسطے شریعت نے خاص قواعد مقرر کئے ہیں اُن سے منتفع ہونا چاہئے۔

دنیاداری کی حقیقت

غرض مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی دنیا کو دین پر ترجیح دینا جائز نہیں۔ پس اس اعتبار سے مسلمان دنیادار ہو ہی نہیں سکتا صرف کفار ہی اہل دنیا ہیں جو دین کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اس شعر کا مطلب تقریر پر بالکل صاف ہوگیا ۔

اہل دنیا کافران مطلق اند روز و شب درچق چق و دربق بق اند

یعنی پہلے مصرع میں مبتدا مؤخر ۔ اور خبر مقدم ہے یعنی جو محض کافران مطلق ہیں صرف وہی اہل دنیا باقی مسلمان کی تو شان ہی اور ہے ﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اللہ ساتھی ہے ان لوگوں کے جو ایمان لائے'' اس میں عام مومنین کے لئے درجہ ولایت ثابت کیا گیا ہے گو وہ ولایت عامہ ہی ہو کیونکہ خاصہ میں اتنا

(۱) نفسانی لذتیں۔

اور زیادہ ہے ﴿الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْ یَتَّقُوْنَ﴾ اور اگر دنیا داری کے معنی عام لئے جائیں کہ طَلَبُ الْمَالِ وَلَوْ عَلٰی وَجْہِ الْحَلَالِ ''مال کی طلب اگرچہ حلال ہی ذریعہ سے ہو'' تو یہ منافی دین کے نہیں، تاکہ ایسا شخص مخاطب احکام دینیہ کا نہ ہو۔ کیونکہ خود حضرت انبیاء علیہم السلام سے کاروبار دنیوی اکل وشرب(۱) ونکاح وصنعت وغیرہ سبھی کچھ ثابت ہے غرض دنیوی کاروبار دین کے منافی نہیں بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے میں ہوں۔

ولایت عامہ

اللہ جل جلالہ کی رحمت تو یہاں تک وسیع ہے کہ باوجود ظلم اور گناہ کے بھی ولایت عامہ اور اصطفائے عام سے مؤمنین کو محروم نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ج فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ ج وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَمِنْھُمْ سَابِقٌ م بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾(۲) ''پھر یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھ پہنچائی جن کو ہم نے اپنے بندوں سے پسند کیا پھر بعضے تو ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے متوسط درجہ کے ہیں اور بعضے ان میں خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں'' ظاہر ہے کہ ﴿فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ ج وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَمِنْھُمْ سَابِقٌ م بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ ''اور بعضے ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے متوسط درجہ کے ہیں اور بعضے ان میں خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ ہیں ﴿مِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَمِنْھُمْ سَابِقٌ م بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰہِ ط﴾

(۱) کھانا پینا (۲) سورۃ فاطر: ۳۲۔

اور بعض ان میں سے متوسطہ درجہ کے ہیں اور بعض ان میں سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں جن کو ہم نے پسند کرلیا ہے) کی قسمیں ہیں اور مقسم کا صدق ہر قسم پر واجب ہے۔ پس اصطفا ظالم لنفسہ کو بھی شامل ہوا۔ بھلا جب گناہ کے ساتھ بھی ولایت عامہ اور اصطفا باقی رہتا ہے تو ضروری اشتغال دنیا کیسے منافی دین ہوسکتا ہے۔ تعجب ہے کہ اپنے منہ سے اس ذلت و بے حمیتی کا اقرار کیا جاتا ہے گویا خدا تعالیٰ نے ان کو دین کے واسطے پیدا ہی نہیں کیا۔

ناپسندیدہ القاب

اور غضب تو یہ ہے کہ ان بھلے مانسوں نے اپنے لئے تو ایسے ناجائز لقب تراشے ہی تھے اہل دین کے لئے بھی ایسے القاب نازیبا کا بے محابا استعمال کرتے ہیں جیسے مسجد کے مینڈھے۔ اس پر بطور جملۂ معترضہ کے ایک ہنسی کی حکایت یاد آگئی ایک طالب علم کو کسی متکبر نے کہہ دیا مسجد کا مینڈھا اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہی ہیں۔ اور اس جواب میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ تو ایک دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے۔ مگر دنیا کا کتا یہ اقراری لقب ہے اور (اَلْمَرءُ یُؤخَذُ بِاِقْرَارِہٖ)''آدمی اپنے اقرار سے پکڑا جاتا ہے'' بالجملہ ایسے القاب اپنے لئے یا غیر کے لئے تراشنا ممنوع ہے قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ج﴾(۱) ''ایک دوسرے کو بُرے القاب سے مت پکارو ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بُرا ہے'' حدیث شریف میں ہے لیس لنا مثل السوء۔

(۱) سورۃ حجرات: ۱۱۔

تواضع میں غلو

عجب ہے کہ بعض لوگ ایسے واہیات القاب کو انکسار اور تواضع سمجھتے ہیں اس کی مثال میں ایک قصہ یاد آ گیا کہ میرے سامنے ریل میں ایک دولت مند مسخرے نے اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ کر ایک شخص کو مدعو کیا تھا اور ان ہی کے ایک جلیس (۱) نے ان کو کہا کہ کھانے کی ایسی بے ادبی تو انہوں نے تواضع کی تھی۔ سو ایسی تواضع حماقت ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتی کہ اپنا نفس بھی ہمارا ملک حقیقی نہیں (۲) کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ ہم سب سرکاری چپڑاسی ہیں۔ سرکاری حد سے زیادہ اس سے کام لینا یا سرکاری اصول کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔

اپنے نفس کی قدر کرنے کی وجہ

اہل اللہ اسی بنا پر کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور عام لوگ کچھ اور سمجھ جاتے ہیں۔ سچ کہا ہے۔

درنیا بد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

"ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیئے اور سلام"

سو وہ حضرات اس حیثیت سے اپنے نفس کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اُس نفس کو سرکاری چیز سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہاتھ پاؤں دماغ۔ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے اُن کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب مستوجب عذاب بنیں گے (۳) آنحضرت ﷺ کا صاف ارشاد ہے کہ (اِنَّ

(۱) ان کے ایک ساتھی نے کہا (۲) اپنے نفس کے بھی ہم حقیقتاً مالک نہیں (۳) عذاب کے مستحق۔

لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا) ''تجھ پر اپنے نفس کا بھی حق اور اپنی بیوی کا بھی حق اور اپنی آنکھوں کا بھی حق ہے''

اگر اپنے دل و دماغ آنکھ کی حفاظت اور خدمت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولی کی سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کی عزت و حرمت خدمت و حفاظت ہم پر بوجہ عبد و خادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔ یہی معنی ہیں (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ) ''اعمال کا ثواب نیتوں پر ہے'' کے اور اس مرتبہ میں کہ ان اعضاء کو محبوب سے تعلق ہے کسی نے کہا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکوئے رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　کہ دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

'' مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں ہر گھڑی اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے''

اور بعض کے کلام سے جو ان اشیاء کا اپنی طرف منسوب ہونا اور اس نسبت کے درجے میں ایسے اقوال صادر ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے کہا گیا ہے ؎

بخدا شکم آید زود چشم روشن خود　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

'' بخدا مجھ کو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ وہ محبوب کے چہرہ انور کو دیکھتی ہیں''

تو یہ غلبہ ہے حال کا ورنہ اہل مقام کی تحقیق وہی ہے۔

تسبیح کا فائدہ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ جب آپ کو دولت وصول میسر ہوچکی تو اب کیوں تسبیح رکھتے ہیں۔ آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ میاں جس کی بدولت ہم کو یہ دولت ملی کیا اب اُس رفیق کو چھوڑ دیں۔ ہرگز نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے گھوڑا پالتا ہے اُس گھوڑے کا بول وبراز[1] بھی ضائع نہیں جاتا بلکہ میزان اعمال میں اُس کے اندازے کے موافق اعمال رکھے جائیں گے اور ان پر ثواب ملے گا۔ یہ سب برکت نسبت الی اللہ کی ہے اور ایسی نفیس اشیاء کے حسنات میں شمار ہونے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص مصری خریدے تو جو تنکا مصری میں ہوگا وہ بھی مصری کے بھاؤ ملے گا۔

درود شریف کی برکت

اور دُعا کے اول وآخر درود شریف پڑھنے کی بھی یہی حکمت ہے کہ درود شریف کو تو اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کریں گے اور یہ ان کے کرم سے بعید ہے کہ اول وآخر کو تو قبول کرلیں اور بیچ والی لپٹی ہوئی چیز کو رد کردیں۔ اور درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول ومحبوب ہیں آپ پر بے کسی کی درخواست کے بھی رحمت فرماتے ہیں سو جب کسی نے آپ پر رحمت کرنے کی درخواست کی تو یہ گویا اُس شخص کی خیرخواہی ظاہر ہوئی جس سے یہ بھی مقبول ہوگیا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہر عید پر اپنے لڑکے کو کچھ انعام دیا کرتا ہے تو وہ تو دے ہی گا۔ اگر کسی شخص نے اُس کو انعام دینے کی نسبت کہہ بھی دیا

(۱) پیشاب پاخانہ۔

تو وہ شخص اُس کہنے کی وجہ سے اس کہنے والے پر بھی مہربان ہوجائے گا۔ اور یہ سمجھے گا کہ اس کو ہمارے لڑکے سے محبت ہے اس لئے درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے۔ اور طفیل میں یہ شخص بھی جب درود شریف قبول ہوگا تو دعا اُس کے ساتھ وہ بھی ضرور قبول ہوگی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کھانڈ کے چنے کہ اندر چنا ہوتا ہے اور اوپر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اُس مٹھائی کے سبب وہ چنے بھی مٹھائی کے حساب میں بکتے ہیں کیونکہ اُن پر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس واسطے وہ اسی کے حکم میں ہوگئی۔ اسی طرح وہ دعا بھی گویا درود شریف کے حکم میں ہوگئی۔ یا جیسے پتے مٹھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر اُن کو کوئی واپس نہیں کرتا۔

جماعت سے نماز پڑھنے کا فائدہ

اور یہی راز اور حکمت ہے نماز میں جماعت کی کیونکہ ؎

بدانرا بہ نیکاں بخشد کریم ''اللہ تعالیٰ بُروں کو نیکوں کے ساتھ بخشدیں گے'' جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں اُن کی نماز غالباً قبول ہوگی۔ اور بروں کی نماز بھی چونکہ نیکوں کے ساتھ ہیں۔ اس واسطے وہ بھی قبول ہوجائے گی۔ اس کی ایک فقہی نظیر ہے (۱) وہ یہ کہ اگر متعدد اشیاء ایک سودے سے خریدی جائیں تو یا سب واپس کی جاتی ہیں یا سب رکھی جاتی ہیں اور جو ہر ایک کا الگ الگ سودا ہوتا ہے تو معیب (۲) کو واپس کر سکتے ہیں ۔ پس اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے یہی معاملہ کرتے ہیں۔ اس لئے جماعت مشروع فرمائی۔ کیونکہ یہ تو مستبعد (۳) ہے کہ سب کی نمازیں واپس فرمائیں تو سب ہی کو قبول فرمالیں گے۔ البتہ اس میں ایک یہ شبہہ رہ گیا کہ

(۱) فقہ میں اسکی ایک مثال موجود ہے (۲) عیب دار چیز واپس کی جاسکتی ہے (۳) یہ تو ناممکن ہے کہ سب کی نمازیں ادا کریں۔

جماعت تو صرف فرضوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ تو اس جماعت کے ذریعہ قبول ہوگئی مگر سنت باقی رہ گئی اس کا جواب یہ ہے کہ تابع ہمیشہ اپنے متبوع کے حکم میں ہوا کرتا ہے سنتیں تابع ہیں فرضوں کے وہ بھی فرضوں کے ساتھ قبول ہوجائیں گی جیسے کہ کوئی شخص گائے بھینس خریدے تو اس کے رسے وغیرہ بھی گو وہ کیسے ہی بوسیدہ ہوں لے لیتا ہے۔ غرض انضمام واقتران (۱) کے یہ فوائد ہیں۔

اچھی نیت کا فائدہ

اسی طرح اگر کوئی شخص اعمال دنیویہ میں بھی نیت خیر رکھے گا تو اُس کو ضرور ثواب ملے گا۔ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی اپنے مرید کے گھر گئے۔ وہاں اُن کے گھر روشندان دیکھا۔ پوچھا یہ کیوں رکھا ہے اُس نے جواب دیا روشنی کے واسطے انہوں نے فرمایا کہ روشنی تو بدوں (۲) نیت روشنی کے بھی آتی اگر اس کے رکھنے میں یہ نیت کرلیتا کہ اس میں سے اذان کی آواز آیا کرے گی تو تجھے اس کا ثواب بھی ملتا رہتا اور روشنی تو خود آہی جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ نیتِ صالحہ رکھنے سے سب اعمال دنیویہ بھی قابل ثواب بن جاتے ہیں۔ پس ایسی دنیا منافی دین نہیں۔ پس ایسا دنیادار بھی دیندار ہی ہے اور پہلے معنی کہ دنیادار کوئی مسلمان نہیں تو سب مسلمان دیندار ہی ہوئے اور دو قسمیں بن کر کوئی فرق نہیں ہوا یہ دیندار دنیادار کا فرق بوجہ جہل بالاحکام کے ہم نے تراش لیا ہے اور جب فرق نہ ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دستور العمل الگ الگ رکھا جائے۔ یہ بات جدا رہی کہ حالت عذر وضرورت میں کسی کے لئے کچھ تخفیف کردی جائے سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دستور العمل ہر ایک کے واسطے الگ الگ تجویز کیا جائے دستور العمل تو ایک ہی رہے گا مواقع

(۱) ساتھ ملنے کے یہ فائدے ہیں (۲) بغیر نیت۔

ضرورت اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے۔

شبہ کا جواب

بس یہ تو طے ہو چکا کہ دستور العمل سب کا ایک ہے مگر عوام کا ایک شبہ اور وسوسہ اور رہ گیا کہ شاید اس دستور العمل کا نفع مشروط ہو فہم کے ساتھ اور وہ مخصوص ہے خواص کے ساتھ تو ہم کو اُس پر چلنے سے کچھ نفع نہ ہوگا سو یہ خیال اور عذر بھی درست نہیں کیونکہ نفع ان اعمال کا علی حسب استعداد سب کو ہوتا ہے جیسے تنجن کھانے سے اُس شخص کو لذت ہوگی جو اُس کی حقیقت اور اجزا سے واقف اور ماہر ہے ایسے ہی وہ شخص بھی متلذذ(۱) ہوگا جو تنجن کی حقیقت سے بالکل واقف نہ ہو اور اسی طرح اُس کا نفع قوت وغیرہ بھی جس طرح اس پہلے شخص کو ہوا ہے اسی طرح اس کو بھی حاصل ہوگا۔ ایسا ہی خیال کرنا کہ اعمال حسنہ کے نفس منافع (۲) اور برکات سب کے لئے عام ہیں ؎

ادیم زمین سفرۂ عام اوست

''روئے زمین اس کا عام دسترخوان ہے''

البتہ خواص کے لئے بوجہ زیادہ فہم کے ایک خاص زائد لذت ہوگی اور آخرت میں بھی اُس کا ثواب اصل عمل کے ثواب پر زائد ملے گا مگر اصل مقصود میں عوام و خواص سب شریک ہیں۔

تسلی آمیز خطاب

اب وہ دستور العمل بیان کیا جاتا ہے اتفاق سے وہ ضروری ہدایات جو

(۱) اس شخص کو بھی لذت حاصل ہوگی (۲) اچھے اعمال کا فائدہ سب کو یکساں ہوتا ہے۔

اس مبحث کے مناسب ہیں ان آیات میں پورے طور پر جمع ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:
﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُۙ○قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًاۙ○نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًاۙ○ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ﴾ الآیۃ ہر چند کہ یہ خطاب آنحضرت ﷺ کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہے اور مزمل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ تو چاہتے تھے کہ یہ کمبخت ایمان لے آئیں تا کہ نارِ جہنم (۱) سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹی تکذیب پر کمر باندر کھی تھی اور آیات الٰہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آنحضرت ﷺ بوجہ شدت غم و رنج و حزن و ملال کے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ ندا و خطاب میں فرمایا گیا۔ تا کہ آنحضرت ﷺ کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہجوم اعداء اور اُن کے طعن و تشنیع سے پریشان ہو رہا ہو اُس وقت اُس کا محبوب خاص اُسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اُس کا تلبس ہے تو دیکھئے اُس شخص کو کتنی تسلی ہوگی اور اس لفظ کی لذت اُس کو کتنی معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے ندا دیکر آنحضرت ﷺ کو تسکین دی گئی ہے۔

صبر کی تلقین

اور بعد اُس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض عارضی احوال پر صبر کرنے کو ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح ارشاد

(۱) دوزخ کی آگ۔

فرمایا ہے کہ ﴿فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اوپر کی مثال میں اُس شخص کا محبوب اُس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو۔ ہم کو دیکھو۔ دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں۔ آؤ تم ہم سے باتیں کرو یہ کام کرو وہ کام کرو اور آنحضرت ﷺ کو تو تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا۔ مگر امت میں اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات کے ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ کے غم وافسوس کی وجہ

اور اس مقام پر لفظ مُــزَّمِّــلُ کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سابقاً معلوم (۱) ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال وحزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا۔ جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین (۲) کے رسول اللہ ﷺ کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی وضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا غم بوجہ غایت شفقت اور رحم کے تھا آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے اُن پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ﴾ الخ ”شاید ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دیدینگے“ ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند درنوشتن شیر و شیر

”نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگر چہ شیر اور شیر لکھنے میں ایک ہی کی طرح ہیں مگر معنوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے“۔

---

(۱) پہلے معلوم ہو چکا (۲) مخالفین کے جھٹلانے کے سبب۔

طبعی غم کا فائدہ

مگر یہ ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال عرفان کے لوازم طبعی سے نہیں نکلتا اور یہی ہونا بھی چاہیئے کیونکہ اگر کسی کو اذیت و مصیبت میں تکلیف جو لازمۂ طبعی ہے محسوس نہ ہوتو صبر کیسے متحقق ہوگا کیونکہ صبر تو نام ہے ناگوار چیز پر ضبط نفس کرنے کا اور جب کسی کو کوئی چیز ناگوار ہی نہ معلوم ہوتو ضبط کیا کرے گا البتہ غلبۂ حال میں محسوس نہ ہونا اور بات ہے لیکن غلبۂ حال خود کوئی کمال کی چیز نہیں۔ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ بیٹے کے مرنے کی خبر سنی تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور ادھر آنحضرت ﷺ کا اپنے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ پر آنسو بہانا ثابت ہے اور یہ فرمانا کہ (اَنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ) ''میں تمہاری جدائی میں اے ابراہیم غمگین ہوں'' اب اگر کسی ظاہر بین شخص کے سامنے یہ دونوں قصے بیان کردیئے جائیں اور یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ قصہ کس کا ہے اور وہ کس کا۔تو ظاہر بات ہے کہ یہ شخص پہلے بزرگ کو جنہوں نے قہقہہ لگایا زیادہ کمال سمجھے گا۔حالانکہ یہ مسئلہ مسلم و بدیہی (۱) ہے کہ ولی کسی حال میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا اور یہ بھی مسلم ہے کہ اولیاء کے کمالات انبیاء کے کمالات سے مستفاد ہیں سو دراصل ان دونوں قصوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس ولی کی نظر صرف حقوق حق پر تھی۔حقوق عباد۔اولاد کی اہمیت اس کے قلب سے مستور تھی (۲) اس واسطے حقوق عباد کا اثر ظاہر نہیں ہوا جو ترحم کی وجہ سے غم پیدا ہوتا۔اور آنحضرت ﷺ کی نظر دونوں حقوق پر تھی حقوق حق پر بھی اور حقوق عباد پر بھی (۳) اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت سے صبر کیا اور جزع فزع نہیں کیا۔ اور حقوق عباد یعنی

(۱) یہ مسئلہ تسلیم شدہ اور واضح ہے کہ ولی نبی سے نہیں بڑھ سکتا (۲) پوشیدہ (۳) اللہ اور بندے دونوں کے حق پر تھی۔

ترحم علی الاولاد کی وجہ سے آنسو جاری ہوئے سخت دلی نہیں کی۔(اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَآءُ)(۱)

انسانوں کی اقسام اوراس کی مثال

اس کی ایک مثال ہے مثلاً آئینہ کے دیکھنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو ضرورت سے خریداری وغیرہ کے صرف آئینے کو دیکھتے ہیں اس کی موٹائی چوڑائی شفافیت پر اُن کی نظر ہوتی ہے ۔ یہ مثال ہے محجوبین غافلین اہل صورت کی اور ایک وہ کہ صرف اُس چیز کو دیکھتے ہیں جو کہ آئینہ میں منعکس ہوتی ہے اور آئینہ کو نہیں دیکھتے یہ مثال ہے غیر کاملین مغلوب الحال لوگوں کی یہ غلبۂ حال سے مظہر (۲) کو نہیں دیکھتے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ایک وہ جو آئینہ اور صورتِ منعکسہ دونوں کو دیکھتے ہیں اور دونوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں اس کو جمع الجمع کہتے ہیں (۳)۔ یہ شان ہے انبیاء علیہم السلام اور عارفین کاملین کی کہ حقوق حق کی رعایت کے ساتھ حقوق عباد کی رعایت بھی اُن کے نصب العین رہتی ہے۔ یہ لوگ جامع ہیں ؎

بر کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق ہر ہوسنا کے نداند جام سندان باختن

''ادھر شریعت کا خیال اُدھر عشق کا خیال شریعت اور عشق کے مقتضٰی پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے''

ایسی باریکیوں کے سمجھنے کے واسطے بڑی فہم کی ضرورت ہے ورنہ ظاہر میں تو ناگوار نہ گذرنا زیادہ کمال معلوم ہوتا ہے۔ بہ نسبت ناگوار گذرنے کے۔

(۱) اللہ اپنے بندوں میں سے رحم کرنے والے بندوں پر رحم کرتا ہے (۲) ظاہر کرنے والے کو (۳) جو سب کو جمع کرنے والے ہیں۔

کیفیات وجدانیہ میں غلطی لگنا

اسی طرح دوسری کیفیات وجدانیہ کے تفاضل میں اسی قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے کہ بعض باتیں کمال سمجھی جاتی ہیں حالانکہ اُن میں کوئی نقص خفی ہوتا ہے جیسے مبالغہ فی التواضع کہ بعض دفعہ مقتضی ہوجاتا ہے ناشکری کی طرف کیونکہ اس میں ایہام ہوتا ہے(۱) انکار نعمت کا ایسے ہی بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ذکر شغل کیا مگر کچھ نہیں ہوا اور سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا انکسار ہے حالانکہ علاوہ ناشکری نعمت ذکر کے اس میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اپنے ذکر و شغل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کیا جائے اور اس کے صلہ میں ان کو بڑا رتبہ دیا جائے اور یہ کبر ہے۔ یہ نفس کے بڑے بڑے مکر ہیں اُن لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ذکر خود ایک مستقل نعمت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اگر کوئی خادم اس قسم کی شکایت کرتا تو آپ فرماتے کہ خود ذکر کی توفیق ہونا کیا تھوڑی نعمت ہے جو دوسرے ثمرات کی تمنا کرتے ہو اور اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

یابم اورایا نیابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوے میکنم

''اس کو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں''

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے ''مصیبت ہوتی اگر یہ نہ ہوتا'' کسی خادم نے حضرت سے بیان کیا تھا کہ میں نے اب کے چلہ کھینچا اور روزانہ سوا لاکھ اسمِ ذات پڑھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا شاید حضرت مجھ سے ناراض ہیں کہ ثمرہ نہیں ملا۔ فرمایا اگر میں ناراض ہوتا تو تمہیں سوا لاکھ پڑھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی۔

(۱) وہم ہوتا ہے۔

ثمرات کے طالب نہ بنو

اور یہ ثمرات کے طالب ایک اور بہت بڑی غلطی میں ہیں کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ ثمرات اصل مقصود ہیں اور اعمال مقصود بالعرض اور یہ سخت غلطیاں ہیں۔ اعمال خود مقصود بالذات نہیں(۱) اور اصل ثمرہ ان کا حصول رضا دخول جنت دیدار خداوندی ہے۔ افسوس ہے کہ طالب ثمرات عشق میں مجنون سے بھی کم ہیں وہ تو لیلیٰ کے نام کی مشق کو بڑا مقصود سمجھ رہا ہے مگر یہ لوگ دوسری چیزوں کی تلاش میں ہیں کیا مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہے ۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　در بیابانِ غمش بنشتہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　مینمودے بہرکس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت بمشق نام لیلےٰ میکنم　　خاطر خود را تسلی میدہم

"کسی نے مجنون کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے اور ریت پر انگلیوں سے کسی کو خط لکھ رہا ہے اس نے دریافت کیا اے مجنون کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں"

ہینم بس کو داندماہ رویم　　کہ من نیز از خریداران اویم
"یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں"

کبھی ثمرات کا قصد مت کرو یہ تو ایک قسم کی مزدوری ہوئی جو کہ عشق و محبت کے سراسر خلاف ہے۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　کہ خواجہ خود رَوِش بندہ پروری داند

(۱) یعنی بہ نسبت ان ثمرات خاصہ مطلوبہ کے۔ ۱۲ منہ۔

’’تو بندگی فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط سے مت کر کہ آقائے حقیقی بندہ پروری کا طریقہ خود جانتے ہیں‘‘

عارف کا حال

ایک عارف کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں انہوں نے اُس پر بھی عبادت کو نہ چھوڑا بلکہ بدستور اسی طور پر پھر عبادت کرتے رہے کسی نے اُن سے کہا کہ جب تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اُس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے کیا اچھا جواب دیا بھائی کہ اگر اور کوئی دروازہ ہوتا تو اُس کو چھوڑ کر اُس طرف چلے جاتے جب دوسرا دروازہ ہی نہیں پھر اور کہاں جائیں اور کیا چارہ کریں ؎

توانی ازاں دل پر داختن　　　کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

’’اس شخص سے دل خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گذر کر سکتے ہو‘‘۔

بس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا تمہارا اور کوئی نہیں تو خیر جیسی کچھ ہے وہی قبول ہے ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستت　　　کہ جز ما پناہے دگر نیستت

’’قبول ہے اگر چہ تمہارا کوئی اس میں کمال نہیں بجز اس بات کے کہ تو نے کہہ دیا کہ ہمارے سوا تیری کوئی جگہ پناہ کی نہیں ہے‘‘۔

مقصود رضاء الٰہی ہو

عبادت میں تو بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا یہی اخلاص

کے بالکل خلاف ہے ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ﴾

از خدا غیر خدا را خواستن ظن افزونیست کلی کاستن

”خدا کا نام دوسری چیز کے مانگنے کی نیت سے لینا تنزلی ہے اللہ کا نام تو اس واسطے ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوں“۔

بدردو صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ انچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

”دردوصاف یعنی قبض وبسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں جو کچھ ساقی نے عطا کر دیا اس کی عین عنایت ہے“۔

طبعی میلان کا حکم

اور اوپر جو بیان ہوا ہے کہ کامل لوازم بشریہ سے نہیں نکلتا اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ طبیعت کا میلان انسانی خواہشوں کی طرف یہ ایک امر طبعی ہے سو طبیعت کا میلان اگر کسی معصیت کی طرف ہو یہ منافی اکمال نہیں (۱)۔ بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ میلان کو بھی مقبولیت وتقوے کے خلاف سمجھتے ہیں اور پھر جی میں کڑھتے ہیں (۲) اور قلب کی ساری توجہ اسی فکر وغم میں مصروف کر دیتے ہیں مثلاً پہلے کبھی کسی کے ساتھ تعشق تھا پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق توبہ کی عطا فرمائی اور وہ تعلق نہ رہا اب اگر حصول کمال کے بعد کبھی طبیعت کی رغبت اس طرف معلوم ہونے لگے تو پریشان ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میلان بھی تقوے کے خلاف ہے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ خود معصیت تو خلاف تقویٰ ہے میلان معصیت اس کے خلاف نہیں۔ میلانِ معصیت بعض اوقات بعد کمال کے بھی زائل نہیں ہوتا۔ اس

(۱) کامل ہونے کے خلاف نہیں (۲) دل برا کرتے ہیں۔

کے زوال کی فکر فضول ہے۔ ہاں البتہ کاملین اور دوسرے میں یہ فرق ہے کہ کاملین کا میلان غیر ثابت اور مغلوب ہوتا ہے تھوڑے سے تذکرہ سے زائل ہوجاتا ہے جناب باری ارشادفرماتے ہیں: ﴿اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (۱) ''جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا تو وہ یاد میں لگ جاتے سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''

اور اس سے پہلے ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ (۲) ''اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے'' اور متوسطین اہل سلوک کا میلان ذرا شدید ہوتا ہے دل کو بہت تنگی پیش آتی ہے اور مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے اور مجوبین کا میلان ادھر غالب ہوجاتا ہے اور حقیقت میں کہ اگر میلان نہ رہے تو معاصی سے بچنا کوئی کمال ہی نہیں اور میلان میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کو ان مدارج میں ترقی نہیں ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی (۳) کے متصور ہے اس لئے ان کے مدارج میں بسبیل لاتقف عندحد ''کسی حد پر نہیں ٹھہرتا'' ترقی ہوتی رہتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے قرب کی برکت

حکیم ترمذی ایک بزرگ گذرے ہیں جوانی میں ایک عورت اُن پر عاشق ہوگئی تھی اور ہر وقت اُن کی تلاش وجستجو میں رہتی آخر کار ایک دن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چاردیواری کی وجہ سے بند تھا وہاں پہنچ کر ان سے اپنے مطلب کی درخواست کی۔ یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے

(۱) سورہ اعراف: ۲۰۱ (۲) سورہ فصلت: ۳۶ (۳) گناہوں کی طرف رغبت ہونے کی وجہ سے۔

بھاگ کر دیوار سے کود پڑے۔ اس قصہ کے بعد ایک روز بڑھاپے کے زمانے میں وسوسے کے طور پر یہ خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اُس کا مطلب پورا کر دیتا اور پیچھے توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہوجاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے ؎

بردل سالک ہزاراں غم بود گر خلالے از بہارش کم شود

''سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے''۔

اور اس پر قلق ہوا کہ جوانی میں تو اِس گناہ سے اِس کوشش سے بچا اور آج بڑھاپے میں یہ حال ہے اور یہ سمجھے کہ جو کچھ میں نے اعمال اشغال کئے ہیں وہ سب غارت اور اکارت گئے اس پر حکیم موصوف نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ اے حکیم کیوں غم کرتے ہو تمہارا درجہ وہی ہے اور جو کچھ تم نے کیا وہ ضائع نہیں ہوا اور اس وسوسہ کی یہ وجہ تھی کہ یہ زمانہ وسوسہ کا میرے زمانہ سے دور ہوگیا تھا اور اس گناہ سے بچنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ زمانہ میرے زمانہ سے قریب تھا اور قرب عہد نبوی ﷺ میں برکت ہے، ایک بزرگ اسی وجہ سے باسی روٹی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے قریب ہے اور تازی میں کسی قدر بعد آ گیا ہے سبحان اللہ جب قربِ عہد نبوت میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوت پر عمل کرنے میں کیسی برکت ہوگی۔

ارشادِ نبوی ﷺ پر عمل کرنے کا فائدہ

ایک مولوی صاحب کہ طبیب بھی تھے مجھ سے اپنا قصہ بیان فرماتے تھے کہ میں بیمار ہوا بخار تھا۔ ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر کار میں نے اس

حدیث کے مطابق جس میں بخار کا علاج غسل سے آیا ہے نہر میں غسل کیا اُن کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے اور بیماریاں تو ہوئیں مگر بخار کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند اہل عقیدت کے لئے سب اقسام کو عام ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسئلہ طبیہ ہے کہ دوا معین ہے فاعل نہیں (۱)۔ سو اہل عقیدت کی طبیعت میں اِس عمل سے قوت ہوگی اور وہ اپنی قوت سے فعل کرے گی (۲)۔

ارتکاب گناہ سے بچنے کا طریقہ

حکیم ترمذی کے اِس قصہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ باوجود میلان کے اُن کو میلان معصیت کا ہوا(۳) اور اُن کے کمال کی تصدیق رسول اللہ ﷺ نے رؤیائے صادقہ میں فرمائی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو شیوخ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بتلا دیجئے کہ کبھی ہم میں بُرے کام کی رغبت ہی نہ پیدا ہو یہ بالکل غلطی ہے اور منشا اُس کا ناواقفی ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے لوازم بشریہ (۴) سے چھوٹ نہیں سکتا۔ کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ یا خیال آہی جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دیکھنے وغیرہ سے اُس کی طرف میلان یا وسوسہ معلوم ہو تو اپنے گھر میں بیوی سے رفع حاجت کرے کیونکہ ﴿اِنَّ الَّذِیْ مَعَهَا الَّذِیْ مَعَهَا﴾ ''جو چیز اس عورت کے پاس ہے وہ اس کی بیوی کے بھی پاس ہے'' اس علاج سے وہ طبیعت کا میلان دور ہو جائیگا اطباء نے بھی تعشق کا علاج تزوج لکھا ہے۔ اگر خاص معشوقہ سے ہو تو بہت ہی بہتر ہے۔ ورنہ

---

(۱) دواء خود صحت دینے والی نہیں ہے بلکہ حصول صحت میں مددگار ہوتی ہے کہ وہ دواء کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے (۲) یعنی جب یہ عقیدہ ہوگا کہ حضور ﷺ نے یہ علاج فرمایا ہے جو یقیناً صحیح ہے تو اس سے طبیعت میں قوت پیدا ہوگی جو معین صحت ہوگی (۳) گناہ کی طرف میلان ہوا (۴) انسانی لوازمات۔

غیر جگہ بھی نکاح کرنے سے دوسرے کے تعشق میں کمی آجاتی ہے۔

وسوسہ کا علاج

باقی تھوڑا بہت میلان تو تمام عمر رہتا ہے۔ اگر اس ایک مقتضی پر عمل نہ ہو تو اُس کی فکر نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اِس کی طرف توجہ کرنے سے اور اس فکر میں پڑنے سے وہ اور بڑھے گا اور تنگی پیش آئے گی اور سالک اِس جھگڑے میں پڑ کر مطالعہ محبوب سے غافل ہوجائے گا۔ اور انسان صرف مطالعۂ محبوب ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو دوسری جانب اتنی توجہ ہی نہ کرنی چاہیئے اگر ان باتوں کی طرف طبیعت کو نہ لگایا جائے گا یہ آپ سے آپ دور ہوجائیں گی بالخصوص وسوسہ کا تو علاج یہی ہے کہ اُس کی طرف خیال ہی نہ کرے اور اپنی توجہ ذکر کی طرف رکھے اس سے وہ وسوسہ خود بخود جاتا رہتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وسوسہ کا آنا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے اس کی وجہ سے جو تنگی پیدا ہوتی ہے وہ موجب تصفیۂ قلب ہوجاتی ہے[۱] اور اس کے دور کرنے میں جو مجاہدہ ہوتا ہے اس سے رفع درجات[۲] ہوتا ہے اور جو بیان کیا گیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے اوپر بدگمانی نہ کرے اور ان باتوں کی طرف زیادہ التفات نہ کرے اور زیادہ موشگافی اور باریک بینی سے کرید کرید کر عیوب کو نہ دیکھے۔ یہ خواص اہل طریق کے واسطے ہے کیونکہ وہ اس طرف لگ کر مطالعۂ محبوب سے غافل ہوجائینگے باقی عوام کو بےفکر نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر وہ اپنے عیوب کی نگہداشت اس مستعدی سے نہ کریں گے تو اور بڑے بڑے گناہوں میں گرفتار ہوجائیں گے۔

---

(۱) دل کی صفائی کا باعث ہوجاتی ہے (۲) درجے بلند ہوتے ہیں۔

تعلقات کی اقسام واحکام

اب ندائے ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ ''کپڑوں میں لپٹنے والے'' کے بعد احکام کا بیان شروع ہوتا ہے حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دوطرح کے ہیں ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے وہ دوقسم کا ہے موافق کے ساتھ اور مخالف کے ساتھ۔ ان ہی تعلقات کے کچھ اعمال وآداب میں چند امر بیان ہوتے ہیں۔

تعلق مع اللہ

اول تعلق خالق کے ساتھ ہے۔اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ ''رات کونماز میں کھڑے رہا کرومگرتھوڑی رات'' اس میں ایک تو قیام وطاعتِ ادب تعلیم کیا ہے اور اُس کے ساتھ اقتصاد ''میانہ روی'' کا اشارہ فرمایا ہے۔ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر فرمایا گیا جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدہ کی پری[1] کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہواور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبہہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کی یہی شان ہوتی ہے کہ نہ بھوک لگے نہ کھانے سے گرانبار[2] ہوں۔اور نیز رات کے وقت یکسوئی بھی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ اس میں تعب تھا[3] بلکہ کچھ حصہ سونے کے لئے بھی رکھا گیا اور چونکہ ہر وقت اور ہر حالت اور ہر شخص کے لئے ایک مقدار معین نہیں ہوسکتی اس لئے ''او'' تخیرہ[4] سے نصف اور

(۱) اس وقت نہ تو بھوک لگی ہوگی نہ ہی معدہ بھرا ہوا ہوگا کہ عبادت کرنے میں دقت ہو (۲) زیادہ کھانے کی وجہ سے طبیعت پر گرانی ہو (۳) تھکاوٹ تھی (۴) ''او'' لا کر اختیار دیا گیا کہ چاہے آدھی رات، تہائی رات اور دو تہائی رات۔

ثلث اور دو ثلث میں جو مفہوم ہے (اُنْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلاً اَوْزِدْ عَلَيْهِ) ''اس نصف سے کسی قدر کم یا نصف سے کچھ بڑھادو'' کا جیسا دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے۔ اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہوسکے تو تھوڑا ہی سہی۔ حدیث میں ہے (وَشَيْءٌ مِنَ الْوَجْهِ) ''کچھ بھی کسی حصہ میں ہو''۔

نمازِ تہجد کے احکام

اس اقتصاد[۱] میں ایک یہ بھی مصلحت اور حکمت ہے کہ توسط میں دوام ہوسکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں[۲] رہ سکتا۔ اور پہلے یہ قیام لیل سے مراد تہجد ہے جو کہ فرض تھا۔ بعد میں اس کی فرضیت منسوخ ہوکر مستونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت مؤکدہ ہونا ہے[۳] تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہورہی ہیں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف اخیر ہی شب میں ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے۔ اس لئے انہوں نے چھوڑ رکھا ہے۔ یاد رکھو کہ اگر اخیر شب میں نہ اٹھ سکے تو اول شب میں بھی وتر سے پہلے تہجد پڑھنا جائز ہے بعضے یہ سمجھ رہے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہ چاہیئے اور سونے سے تہجد جاتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اس لئے نہیں اٹھتے یہ بھی غلطی ہے تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے غرض اہل سلوک کے لئے یہ عمل تہجد کا بھی ضروری ہے اور اگر کبھی قضا ہوجائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے تہجد کی قضا کرلے اس آیت سے یہی مراد ہے ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ﴾ ''وہ ایسا ہے جس نے رات اور

---

(۱) اس میانہ روی میں یہ فائدہ ہے کہ ہمیشہ وہ عمل کرسکتا ہے (۲) اور زیادتی میں ہیشگی نہیں ہوسکتی (۳) تہجد کا سنت موکدہ ہونا دلیل سے ثابت ہے۔

دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے بنائے اور یہ سب کچھ جو دلائل مذکور ہوئے اس شخص کے سمجھنے کے لئے ہیں جو سمجھنا چاہے'' بعض لوگوں کا تہجد اگر قضاء ہوجائے تو حد سے زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا یہ کیا ہوگیا یاد رکھو اتنی پریشانی کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بجائے مطالعہ محبوب کے اپنے مطالعہ میں مشغول ہوجاتے ہیں (۱) حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو غیر میں مشغول نہ ہونا چاہیئے۔

ماضی و مستقبلست پردۂ خداست

''ماضی و مستقبل بندہ اور خدا کے درمیان حجاب ہے''۔

نفس کی دلداری

غرض نفس کو پریشانی میں زیادہ مبتلا نہ کیا جائے اور تجربہ ہے کہ بعض اوقات آسانی رکھنے سے نفس خوشی سے کام دیتا ہے اور تنگی اور بوجھ ڈالنے سے پہلا کام بھی چھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے بہت تنگی نہ کرو۔ کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔ ''مزدور خوش دل کام زیادہ کرتا ہے'' بعض محققین کا قول ہے کہ ذاکر شاغل کر مرغن کھانا کھانا چاہیئے۔ ورنہ ضعف ہوجائے گا۔ اور کسی وقت بیکار ہوجائے گا۔ خوب کھاؤ پیو اور اس سے کام لو۔

اسراف سے احتراز

البتہ یہ یاد رہے کہ کھانے پینے میں ایسی زیادتی نہ ہو کہ کسل ہوجائے یا بیماری ہوجائے۔ بیمار ہوکر اور خرابی میں پڑجائے اسی لئے ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾

(۱) بجائے محبوب کی طرف توجہ ہونے کے اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔

''کھاؤ اور پیو'' کے ساتھ ﴿لاَ تُسْرِفُوْا﴾ ''فضول خرچی نہ کرو'' بھی فرمایا ہے حضرات اہل بیت میں سے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن سے کسی نصرانی حکیم نے پوچھا تھا کہ قرآن کو کتاب جامع کہتے ہیں اس میں طب کہ ضروری چیز ہے نہیں ہے۔ فرمایا اصل طب موجود ہے ﴿کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلاَ تُسْرِفُوْا﴾ ''کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو'' وہ دنگ رہ گیا بطور جملۂ معترضہ کے یاد آ گیا کہ غالب جو ایک آزاد شاعر ہے اس نے اپنے مذاق پر یہ شعر کہا تھا ۔

ہم توبہ جب کریں گے شراب و کباب سے
قرآن میں جب آیا کُلُوا وَاشْرَبُوا نہ ہو

''کھاؤ پیو کسی نے کیا خوب جواب دیا ۔

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب
جب آگے وَاشْرَبُوا کے وَلاَ تُسْرِفُوا نہ ہو(۱)

وسوسہ کے آنے سے پریشان نہ ہو

ایسے ہی روحانی تنگی قبض حزن وغیرہ سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں بھی تذکیہ نفس ہوا کرتا ہے(۲)۔ خاص کر وسوسہ کی طرف تو التفات بھی نہ کرنا چاہیئے کیونکہ درپے ہونے سے اس میں اور بھی ترقی ہوتی ہے محقق اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتا اور وسوسہ کے پیچھے پڑنے میں اس کے سوا اور بھی بہت

---

(۱) اسی طرح حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی نوراللہ مرقدہ نے اس مشہور شعر کا جواب دیا ہے جس میں کہا گیا ہے۔ ہنگامہ ہے بپا کیوں ہے تھوڑی سی جو پی لی ہے ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے۔ مفتی صاحب جواب دیتے ہیں۔ اک قطرہ مے کو بھی ہلکا نہ سمجھ ظالم۔ اسلام پر ڈاکہ ہے ایمان کی چوری ہے (۲) نفس کی صفائی۔

خرابیاں ہیں۔اسی ایک وسوسہ سے اور شاخیں نکلنی شروع ہوتی ہیں اور رہا غم سو وہ الگ ہے اور غم کی وجہ سے اصل ذکر شغل کا فوت ہونا یہ الگ ہے۔

توبہ کرنے کا طریقہ

ایسے ہی استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکر و استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جائے۔صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرے ہر گناہ کا نام ضروی نہیں۔ حدیث میں ہے(وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ)''اور وہ گناہ بھی جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں''اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے اس میں سب گناہ آگئے اگر چہ یاد نہ آئیں کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعۂ محبوب سے غافل ہونا ہے۔البتہ جو خود یاد آجائے اس سے بالخصوص بھی توبہ کرلے۔ایک شخص کا ذکر ہے کہ رمی جمار کے وقت وہاں جوتیاں مار رہا تھا اور ایک ایک گناہ گن کر شیطان کو گالیاں دیتا تھا اور مارتا تھا سو یہ لغو ہے۔ ہر ایک گناہ کا نام لینا اور تلاش اور سوچ میں عمر عزیز کو جو دراصل مطالعہ محبوب کے لئے تھی اس سوچ بچار میں کھونا نہ چاہیئے ؎

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست ایں رشتہ رامسوز کہ چندیں دراز نیست

''عمر عزیز مفت ضائع نہ کرنی چاہیئے۔رشتہ دراز نہیں اس کو مت جلاؤ''

حق تعالیٰ کا قرب مقصود ہے جیسے بھی ہو

اہل سلوک کو بالخصوص اس کا خیال بہت ضروری ہے کہ مطالعہ محبوب سے غفلت نہ ہو۔ واقع میں عارف ہی کی نظر ان امور تک پہنچتی ہے۔حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی خادم نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اب کی بیماری کی وجہ

سے مدت تک حرم میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا۔ آپ نے خواص سے فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو اس پر کبھی افسوس نہ کرتا کیونکہ مقصود قرب حق ہے اور اُس کے لئے جس طرح نماز حرم ایک طریق ہے اسی طرح اس کے لئے مرض بھی ایک طریق ہے تو بندہ کا کیا منصب ہے کہ اپنے لئے خود ایک طریق معین کرے۔ یہ مربی کے اختیار میں ہے۔ طبیب کی تجویز مریض کی تجویز سے ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے۔

بدردوصاف ترا حکم نیست دم درکش　　　کہ ہرچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

''درد وصاف یعنی قبض وبسط کی تجویز کا ہم کو حق نہیں ہے جو کچھ عطا ہو جائے ترتیب باطنی کے لئے وہی مصلحت اور وہی عین لطف ہے''

تلاوت قرآن کا فائدہ

یہ سب بیان تھا قیام لیل اور اس کے آداب کا اقتصاد کے ساتھ اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ ''قرآن پاک کو ترتیل کے ساتھ پڑھو'' ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا۔ صحابہ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آجکل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کونسا طریقہ آپ کے موافق ہے اور اُس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کرلیا ہے مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کے قلوب بہ برکت صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس قابل تھے کہ اُن کو اور قیود کی جو بعد میں حادث ہوئیں (۱) ضرورت

(۱) بعد میں پیش آئیں۔

نہ تھی۔ ان کے قلوب میں صحبت نبوی ﷺ کے فیض سے خلوص ہو چکا تھا وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے اُن کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی۔

ذکر میں جہر وضرب کی قید کی وجہ

برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدوں اہتمام کے پیدا نہیں ہوسکتا اس لئے صوفیۂ کرام نے کہ اپنے فن کے مجتہد گذرے ہیں۔اذکار اشغال خاصہ اوران کی قیود ایجاد (۱) کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بتکرار ورد کیا جاتا ہے (۲) اور اُس کے ساتھ ضرب وجہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اور اس کی تاثیر نفس وقلب میں اوقع واثبت ہوتی ہے (۳) اور رقت وسوز پیدا ہوکر موجب محبت ہوجاتا ہے اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ﴾ ''ان لوگوں کو یہی حکم کیا گیا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خاص رکھیں''

اور مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اس طرح عبات کروں الخ وغیرہ من الآیات پس معلوم ہوا کہ حضرت صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے بطور معالجہ تجویز فرمائے ہیں اور اصل مقصود وہی اخلاص ہے۔ پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا ہوسکتا ہو تو صوفیۂ کرام ایسے شخص کے لئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پس اب

(۱) خاص ذکر خاص خاص اوقات میں کرنے مقرر کئے (۲) ایک ہی ذکر مثلاً لا الٰہ الا اللہ کو بار بار کہا جاتا ہے اور ضرب یعنی سر کی حرکت سے دل کی طرف اشارہ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے (۳) اس کا اثر دل اور نفس میں زیادہ قوی ہوتا ہے اور اللہ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

معلوم ہوگیا کہ یہ تمام قیود اصلاح وتقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں کوئی شرعی امر قربت مقصود نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔ الحاصل یہ دوسرا دستور العمل تھا اہل سلوک کے واسطے یعنی تلاوت قرآن۔

وحی النبی کا وزنی ہونا

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ ''ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں'' اس کو ماقبل سے اس طور پر ربط ہے کہ مراد قَوْلًا ثَــقِیْلًا ''بھاری کلام۱۲ سے وحی ہے جو کہ ثقیل تھی اور نماز اور تلاوتِ کلام مجید کی مزاولت سے قوت احتمال اثقال وحی کی پیدا ہوگی(۱) اس لئے پہلے نماز اور تلاوت کا حکم فرمایا۔ پھر اِنَّا سَنُلْقِیْ الخ میں وحی کا وعدہ کیا اب اس کی تحقیق کہ نزول وحی کے وقت ثقل معلوم ہونے کا کیا سبب تھا سو یہ امر عقول متوسطہ سے خارج ہے(۲) باقی روایات سے ثقل ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ نزول وحی کے وقت اونٹنی کا بیٹھ جانا اور ایک صحابی کا یہ قول کہ نزول وحی کے وقت (جبکہ آنحضرت ﷺ کی ران ان کی ران پر تھی) یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری ران بیٹھی جاتی ہے اور آنحضرت ﷺ کو سخت شدت سرماء میں بھی نزول وحی کے وقت پسینہ آجاتا۔ اس ثقل کے آثار روایت میں وارد ہیں اور ان آیات میں کہ ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ ''کیا ہم نے آپ کی خاطر سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی'' یہ شرح صدر اور وضع وزر جو موجب نقض ظہر تھا(۳) میرے نزدیک اسی طرف اشارہ ہے اور آیت ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا

(۱) نماز اور کثرت تلاوت کرنے سے وحی جو کہ ثقیل ہے اس کا بوجھ اٹھانے کی قوت پیدا ہو جائیگی (۲) عام عقل والے اسکو نہیں سمجھ سکتے (۳) پس بوجھ کا دور کر دینا جو کمر توڑ دینے کا باعث تھا۔

هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ الخ﴾ ''اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے'' اس معنی میں بھی بہت ہی صاف ہے اور نماز اور تلاوت اور ذکر کی مداومت اور کثرت سے قوت کا پیدا ہونا اور ثقل وحی کی احتمال کی طاقت پیدا ہوجانا (۱) اس طور پر ہے کہ چونکہ ذکر وغیرہ سے واردات اور فیوض غیبیہ علمی و عملی قلب پر فائض ہوتے ہیں ان کے ورود سے قلب میں بتدریج قوت پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے شدت و ثقل کا مقابلہ اُس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔

سالکین کی مختلف کیفیات کی وجہ سے اور فائدہ

چنانچہ اہل تلوین کا اضطراب اور اہل تمکین کا استقلال اسی وجہ سے ہے کہ پہلے قلب میں قوت تحمل کی نہ تھی۔ پھر ذکر کی کثرت سے احتمال اثقال کی طاقت آگئی اور اس شعر میں واردات میں سے بعض کا ذکر ہے۔

بینی اندر خود علوم انبیا بے کتاب و بے معید واوستاد

''اپنے اندر بغیر کتاب ومعاون اور استاد کے انبیاء علیہم السلام جیسے علوم دیکھو گے''

اور یہ حالات واردہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں کبھی ذوق وشوق وسرور وانبساط (۲) ہوتا ہے کبھی حزن و انقباض ہوتا ہے (۳)۔ بسط کے الگ فائدے ہیں اور قبض کے علیحدہ مصالح (۴) اور سب محمود ہیں کیونکہ قبض میں بھی تزکیہ نفس

(۱) کثرت نماز تلاوت اور ذکر سے دل میں ایسی قوت کا پیدا ہونا کہ جس سے وہ وحی الٰہی کے بوجھ کو اٹھا سکے اسکی وجہ ہے کہ ان اعمال سے علمی اور عملی، غیبی فیوض دل پر وارد ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں وحی کے بوجھ کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ (۲) کبھی عبادت ذکر واذکار میں مشغول ہونے کا شوق ہوتا ہے اور ان کاموں کے لئے طبیعت بخوشی راضی ہوتی ہے (۳) اور کبھی طبیعت پر غم کا غلبہ ہوتا ہے اور ذکر اذکار میں دل نہیں لگتا (۴) ان دونوں کیفیات کے الگ الگ فوائد ہیں۔

واصلاح عجب ہوتی ہے ۔

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں تازہ باش وچیں میفگن برجبیں

’’جب قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا ملاحظہ کرو خوش وخرم رہو پیشانی پر بل نہ ڈالو‘‘۔

چونکہ قبض آید اے راہرو آں صلاح تست آیش دل مشو

’’جب تم کو قبض کی حالت پیش آئے وہ تمہاری اصلاح باطنی کے لئے ہے اس سے رنجیدہ مت ہو‘‘۔

قیام اللیل کا فائدہ

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ ﴿ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلاً ﴾ ’’بیشک رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے‘‘ اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت چونکہ شوروشغب سے سکون ہوتا ہے اور افعال معاش (۱) کا بھی وقت نہیں ہوتا اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اور اس لئے اُس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل کو اس سے بہت تاثیر ہوتی ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا اثر قوی ہوتا ہے تو گویا اس آیت میں ﴿ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾ الخ ۔مضمون آیت ماقبل ﴿ قُمِ الَّيْلَ ﴾ اور ﴿ رَتِّلِ الْقُرْآن ﴾ کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ ان اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے لہذا قیام لیل وترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا۔

(۱) کھانے کمانے میں مشغولیت کا بھی وقت نہیں ہوتا۔

نماز میں حضور قلب حاصل ہونے کا طریقہ

اور حضور قلب کے متعلق ایک طریقہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ مبتدی ہر ہر لفظ پر بتکلف مستقل ارادہ کرے(۱)۔ اسی طرح الفاظ پر توجہ رکھنے سے حضور حاصل ہوجاتا ہے اور بعد چندے ملکہ ہوجاتا ہے(۲) زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اور منتہی کو ملاحظۂ ذات سے (۳)حضور میسر ہوسکتا ہے ابتداء میں یہ مشکل ہے کیونکہ مبتدی کو غائب کا تصور جمتا نہیں اور منتہی ذات کا ملاحظہ رکھ سکتا ہے۔

مخلوق کی طرف توجہ کمال کے منافی نہیں

اس کے بعد فرماتے ہیں ﴿اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ﴾ ''بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے''

پہلے بطور حکمت کے بیان ہوا ہے کہ تہجد اور قرآن مجید پڑھا جائے کیونکہ اس وقت اس کا اثر زیادہ ہوگا اب اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور کام بھی رہتے ہیں ان کی وجہ سے خاص قسم کی توجہ الی اللہ تام نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہ وقت شب کا کہ مصروفیت سے خالی ہے تجویز کیا گیا اور وہ کاروبار یہ ہیں۔ مثلاً تبلیغ دین۔ تربیت خلائق۔ حوائج ضروریہ لازمیہ بشریت ہر چند کہ تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے لہذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہوسکتی جیسی خاص خلوت میں ہوسکتی ہے یہاں سے بھی اُس اوپر والی بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان باوجود کمال کے بھی لوازم بشریہ سے بالکل نہیں چھوٹ سکتا۔ دیکھئے آیت

(۱) ہر ہر لفظ سوچ کر ادا کرے کہ اب یہ لفظ پڑھ رہا ہوں (۲) اس طرح مشق کرنے سے چند روز میں عادت ہوجاتی ہے (۳) ذات باری کے تصور سے حضور قلب حاصل ہوجاتا ہے۔

صاف دلالت کر رہی ہے کہ نہار کا سبح طویل یکسوئی سے ایک درجہ میں آپ کو بھی مانع ہو جاتا تھا اور چونکہ آپ کے تمام احوال کامل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خلق کی طرف مشغول ہونا منافی کمال نہیں۔ پس صاحب کمال پر بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی۔

تغیر احوال کا فائدہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا قصہ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ نے اپنے کو اس بنا پر منافق کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے کچھ اور اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ حالت تو ہماری بھی ہے۔ آخر یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةٌ وَسَاعَةٌ) ایک گھڑی کیسی ایک گھڑی کیسی اور درحقیقت اگر ہر وقت وہی حالت تجلی کی رہے خود جسمانی ترکیب بھی ٹھیک نہ رہے اول تعطل ہوگا(۱) کیونکہ حالت علیہ میں انتظام تغذیہ وغیرہ کا ممکن نہیں(۲)۔ پھر اس فنا کی نوبت آجائے گی ولنعم ما قیل۔

چو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم درکشد

''جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں''

دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ ذوق ولذت جب ہی آتی ہے کہ اس حالت میں دوام نہ ہو ورنہ دوام سے عادت ہو جائے گی۔ اور لذت جو بسبب جدت کے معلوم ہوتی ہے نہ رہے گی (كُلُّ جَدِيْدٍ لَذِيْذٌ) ''ہر نئی چیز مزہ دار ہوتی ہے'' اس

(۱) جسمانی قوتیں بیکار ہو جائیں (۲) اس قسم کی بلند حالت پیش آنے کی صورت میں غذا وغیرہ کا انتظام واہتمام نہیں ہوسکتا۔

کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ غلبۂ استغراق میں قصد نہ رہے گا اور بلاقصد کے اعمال کا اجر نہیں اور بلا اعمال قرب نہیں ملتا اور اعمال ہی دنیا میں مقصود ہیں۔ دنیا میں انہیں اعمال کے واسطے بھیجا گیا ہے۔ ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے روح کو خود ایسی حالتیں حاصل تھیں اور حضور دائم میسر تھا مگر اعمال نہ تھے۔ جن کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا لہٰذا اعمال اور ان کا اجر امر مہتم بالشان ٹھہرا۔ اس لئے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ استغراق میں ترقی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوگیا کہ تجلی میں جیسی حکمتیں ہیں ویسی ہی استتار میں بھی ہیں (۱)۔

منتہی کو خلوت میں عبادت کا فائدہ

اور یہاں ایک فائدہ قابل غور معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ تبلیغ دین و تعلیم احکام متعدی نفع ہے اور وہ نفع لازمی سے بڑھ کر ہے اس لئے منتہی کو اس کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ ارشاد ہے کہ چونکہ آپ کو دن میں بہت کام رہتے ہیں رات کو تہجد اور ترتیل سے قرآن پڑھا کیجئے اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ (فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَرْغَبْ) ''آپ جب فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھیئے'' اس سے یہ ثابت ہوا کہ کامل کو اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔ اور بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیئے اور نہ از خود اس کا وہ حال رہے گا نہ دوسروں کو اس سے کامل نفع پہنچے گا کیونکہ بدون (۲) خود کئے ہوئے تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ یہی معنی ہیں قول

---

(۱) اللہ کی تجلی کے ظہور میں جیسی حکمتیں ہیں اسی طرح اس کے پوشیدہ ہونے میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں

(۲) بغیر خود کئے۔

مشہور (مَنْ لَاوِرْ دَلَهٗ لَاوارِدَلَهٗ) ''جس کے لئے درد نہیں اس کے لئے دارو بھی نہیں کے البتہ یہ غلطی ہے کہ منتہی قطع تعلق کر کے دوام خلوت اختیار کر لے ۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست　　بہ تسبیح و سجادہ ودلق نیست

''طریقت خدمت خلق کا نام ہے تسبیح مصلٰی اور گدڑی کو نہیں کہتے ہیں''

لیکن خود اپنے کو قابل ارشاد نہ سمجھنے لگے۔ البتہ جب شیخ اجازت دے دے تو امتثالاً اس کام کو بھی شروع کر دے اور پہلے سے اس کی نیت کرنا اور ذکر وشغل اس نیت سے کرنا بھی مضر ہے۔ اور اس نیت کے ساتھ کامیابی مشکل ہے۔ وجہ یہ کہ یہ نیت بڑا بننے کا شعبہ ہے۔

کامل کے متوجہ الی المخلوق ہونے پر شبہ اور اسکا جواب

اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشتغال بالخلق اُس کو یادِ حق سے مانع ہوگا(۱)۔ سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں کیونکہ منتہی کی بسبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یادِ حق سے مانع نہیں ہوتا(۲) اور نیز خلق کے ساتھ اُس کا مشغول ہونا بھی بامرِ حق (۳) ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل وعلا ہی ہوتی ہے (۴) اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق (مخلوق میں مشغول ہونا حق سے مانع نہیں ہوتا) نہیں ہوسکتا بلکہ یہ

(۱) مخلوق کی طرف متوجہ ہونا خالق کی یاد سے غافل ہونے کا سبب بنے گا (۲) منتہی کے قلب میں وسعت ہونے کی وجہ سے مخلوق کی طرف متوجہ ہونے سے یادِ خالق سے غفلت نہیں ہوتی (۳) اللہ کے حکم سے (۴) اس سے مقصود اللہ کے حکم کو ماننا اور اس کی رضا ہی ہوتی ہے۔

اشتغال خود حقوق خلق سے ہے(۱)۔ اور اس آیت میں (سَبۡحًا طَوِيۡلًا) بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے اس حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے۔ تصحیح عام۔ تربیت ارشاد(۲) لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیئے۔ چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے بیان سے پہلے (قُمِ الَّيۡلَ) میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے۔ اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی (وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ) ''اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو'' فرمایا گیا ہے۔ تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا۔ اول آخر دونوں جگہ یاد دلایا گیا ہے۔

تفسیری نکتہ

اور (وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ) میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہو گیا اور (اِخۡتِلَافُ اُمَّتِىۡ رَحۡمَةٌ) ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے'' کا ظہور ہو گیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ اسم کا قول تو موافق حالت منتہی کے ہے(۳) اور عدم زیادہ کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے(۴) کیونکہ مبتدی کو خود مسمّی اور مذکور کا تصور کم جمتا ہے (۵) اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصور ہو جائے۔ برخلاف منتہی کے۔ اس کو ملاحظۂ ذات بلاواسطہ سہل ہے(۶) اور حدیث (اَنۡ تَعۡبُدَاللّٰهَ كَاَنَّكَ

---

(۱) مشغولی اصل مخلوق کا حق ہے (۲) عوام کی اصلاح وتربیت کرنا (۳) اگر یہ قول اختیار کیا جائے کہ اس جگہ لفظ اسم زائد ہے تو یہ منتہی کی حالت کے زیادہ مناسب ہے (۴) اور اگر یہ قول اختیار کریں کہ یہاں لفظ اسم زائد نہیں ہے۔ تو یہ مبتدی کی حالت کے موافق ہے (۵) مبتدی اللہ کا تصور نہیں کر سکتا اس لئے اس کو اسمِ رب کا تصور کرنا چاہیئے (۶) بخلاف منتہی کے کہ اس کو اللہ کی ذات کا تصور بغیر واسطہ کے آسان ہے۔

تَــــرَاہُ)''تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو'' میں مشہور توجیہ پر منتہی کا طریق اور اس کی حالت کا بیان ہے اور عام کے لئے حضور کا ایک سہل اور مفید طریق خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کرلے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اُس کو سنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسر ہوجاتا ہے۔

قطع تعلق کے معنی

اس کے بعد ارشاد ہے ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً ﴾''اور سب سے قطع کر کے اس طرف متوجہ ہوجاؤ'' اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبتل کو صرف ﴿وَاذْکُرِ اسْمَ ﴾ کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تبتل سے ارشاد ہوگا مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کے ساتھ مراقبہ ہوا اور ایک یہ کہ تبتل کو مستقل حکم کہا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور حبّی سے مغلوب ہوجائے (۱) اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلا ایک وقت میں دو کام متضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے تعلق کا ہے اور دوسرا غیر اللہ کے تعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہیں قطع تعلق کے۔ نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے ۔

تعلق حجاب است و بے حاصلے چو پیوندہا بگلے واصلے

'' تعلقات غیر اللہ حجاب اور لاحاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع

---

(۱) اللہ کی ذات کا علم اور اس کی محبت سب پر غالب ہو

کرلوگے تو تم واصل ہوگے''۔

البتہ اختلاط میں افراط کرنا مضر ہے (۱)۔

سالکین کو توکل کی ضرورت

اس کے آگے فرماتے ہیں کہ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلاً﴾ ''وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے اوراس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کرنے کے لئے قرار دیتے رہو''

مطلب یہ کہ اللہ پر توکل کرو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سلوک کے لئے توکل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ان کا معمول ہونا چاہیئے نکتہ اس توکل کی تعلیم میں یہ ہے کہ اعمال مذکورہ بالا کے اختیار کرنے کے بعد حالت میں تغیر تبدل قبض وبسط شروع ہوگا (۲) اس میں ضرورت توکل کی ہوگی اس لئے فرماتے ہیں کہ آخر وہ مشرق ومغرب کا رب ہے اس لئے اس نے جو حالت تم پر وارد کی ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہوگی۔

اور ثابت ہے کہ اکثر قبض میں تصفیہ وتذکیہ خوب ہوتا ہے (۳) اس لئے تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہیئے اور خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اس میں کچھ مصلحت رکھی ہوگی اور مشرق ومغرب کا ذکر قبض وبسط (۴) کی حالت کے کس قدر مناسب ہے

---

(۱) مخلوق سے زیادہ میل جول رکھنا نقصان دہ ہے (۲) حالت میں تبدیلی آئیگی کبھی تنگی کبھی کشادگی ہوگی (۳) حالت قبض میں دل کی صفائی اور پاکیزگی خوب حاصل ہوتی ہے (۴) قبض وبسط یہ تصوف کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تجلی جلالی یعنی آثار واستغنی کے فی الحال دل پر وارد ہونے سے دل گرفتہ ہوتا ہے اس کو قبض کہتے ہیں اور قبض کے مقابل حالت بسط ہے یعنی آثار لطف وفضل الٰہی کے وجود سے دل کو سرور وفرحت ہوتی ہے یہ بسط کہلاتا ہے۔۔

مشرق تو حالت بسط کے مناسب ہے کہ اس میں ظہور ہوتا ہے واردات کا اور مغرب مناسب ہے حالت قبض کے پس مشرق ومغرب کا نمونہ باطن انسان میں بھی پایا گیا۔ ولنعم ما قیل ؎

اسمانہا است درولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں
در رہِ روح پست و بالاہاست کوہ ہائے بلند وبالاہاست

''ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں نشیب وفراز کوہ صحرا موجود ہیں''۔

اور جس طرح مغرب میں آفتاب مستور ہوتا ہے معدوم نہیں ہوتا اسی طرح قبض میں کیفیات سلب نہیں ہوتیں بلکہ مستور ہوجاتی ہیں اور پھر بسط میں گویا طلوع ہوجاتی ہیں۔

معمولات

حاصل کُل کا یہ ہوا کہ اہلِ سلوک کے لئے یہاں چند ضروری معمول بیان کئے گئے قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن، تبلیغ دین، ذکر وتبتل، توکل، اور چونکہ تعلق خلق کی دو قسمیں ہیں[1] ایک موافقین کے ساتھ اس کا بیان اشارۃً ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا﴾ ''اور بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے'' میں ہوا ہے۔ جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد وتربیت ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت کا ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب[2] کی وجہ سے خود بخود ادا ہوجاتے ہیں اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی البتہ

(۱) مخلوق کے ساتھ تعلقات کی دو قسمیں ہیں (۲) محبت کے تقاضے سے

مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط وتفریط ہو(۱) جاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَایَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہیئے اچھے طور پر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے اُن کی آتش عناد اور بھڑک اُٹھے(۲) اور زیادہ تکلیف پہنچائیں ہجر جمیل(۳) سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب میں تنگی نہ ہو۔

صبر کی تعلیم اور تسلی کا مضمون

پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس کی تسہیل کے لئے حضور ﷺ کو اسی اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کی تسلی بھی فرمائی جاتی ہے کہ ﴿وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا﴾ یعنی مخالفین کے معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیجئے ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے۔ یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں اس لئے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے کیونکہ جب اپنے سے بالا دست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کی جائے خدا تعالیٰ کی اس سنت کے موافق مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہوجاتی ہے ۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   باوردکشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

''اس دیر مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے

(۱) کمی زیادتی ہوجائے (۲) ان پر سختی کرنے سے کہیں ان کی دشمنی کی آگ اور زیادہ نہ ہوجائے (۳) خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کرنے سے مراد قطع تعلق کرنا ہے۔

الجھا ہلاک ہوگیا‘‘۔

ہیچ قومے را خدا رسوانہ کرد تا دلے صاحب دلے نامد بدرد

ہیچ قومے را خدا رسوانہ کرد بادردکشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

’’خدا تعالیٰ نے کسی قوم کو رسوا نہیں کیا جب تک اس نے کسی صاحب دل کو رنجیدہ نہیں کیا‘‘۔

وعظ کی وجہ تسمیہ

الغرض اہل تصوف کی معمول بہ چند چیزیں ہوئیں جن کا بیان اس مقام پر ہوا قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن، تبلیغ دین، ذکر، تبتل، توکل، صبر۔ اس لئے اس مجموعہ بیان کو جو کہ اہل تصوف کے معمولات کو بفضلہٖ حاوی اور شامل ہے ’’سیرت الصوفی‘‘ کے لقب سے ملقب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

صوفیاء کے چادر اوڑھنے کی وجہ

اور یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ میں دو لطیفے بھی معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن والم(۱) اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو(۲) اور اس سے قلب منتشر(۳) نہ ہو اور جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے(۴)۔

دوسرا لطیفہ یہ کہ المزّمّل کے معنی عام کمبل اوڑھنا بھی ہے تو ﴿یٰاَیُّهَا

(۱) بہت زیادہ غم اور پریشانی کے سبب (۲) ادھر ادھر نامحرموں وغیرہ پر نظر نہ پڑے (۳) دل پریشان نہ ہو (۴) یک سوئی کے ساتھ ذکر کرسکے۔

الْمُزَّمِلُ ﴾ میں اشارہ ہوگا لقب یاایُّھَا الصُّوْفِیْ کی طرف کیونکہ لفظ صوفی میں گو اختلاف ہے مگر ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کمبل وغیرہ مراد لیا جائے۔ پس صوفی اور مزمل متقارب المعانی ہوئے (۱)۔

لفظ صوفی کے معنی

اور اہل تصوف نے یہ لباس اس لئے اختیار کیا تھا کہ جلدی پھٹے نہیں جلدی میلا نہ ہو اور بار بار دھونا نہ پڑے اور بعض اہل شفقت اس خاص وجہ سے بھی یہ شعار رکھتے تھے (۲) مستور ہونے کی حالت میں بعض لوگ ان کو ایذا پہنچا کر مبتلائے وبال ہوجاتے تھے اس لئے انہوں نے ایک علامت مقرر کی جیسے آیت: ﴿ذَالِكَ اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلاَ یُوْذَیْنِ﴾ (۳) اس کی نظیر ہے بس یہ حکمتیں تھیں اس لباس میں اور اب تو محض ریا وسمعہ (۴) کی غرض سے پہنتے ہیں جو بالکل اس شعر کا مصداق ہے ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد ‌ ‌ ‌ ‌ اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

''صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست اور بیغش نہ ہو وہ صوفی نہیں۔ اگر چہ خرقہ پہن لے اے شخص! بہت سے خرقہ آگ میں جلانے کے قابل ہیں''۔

---

(۱) پس صوفی اور مزمل کے معنی قریب قریب ہی ہیں (۲) طریقہ (۳) سورۂ احزاب: ۵۱ (۴) دکھاوے اور تکبر کی غرض سے۔

اس لئے یہ اب قابل ترک ہوگیا ہے(۱)

واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین والسلام علی المرسلین وعلی عباداللّٰہ الصالحین برحمتك یا ارحم الراحمین۔ فقط (۲)

(۱) اب اس صوفیانہ وضع اختیار کرنے کو ترک کردینا چاہئے (۲) اللہ تعالیٰ اس وعظ سے استفادہ کرنے والوں کو اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔آمین۔ (خلیل احمد تھانوی)

خلیل احمد تھانوی